قرآن شناسی

تفسیر سورہ البقرہ

عماد العلماء علامہ سید علی محمد نقوی صاحب مدظلہ الشریف

''متقین کے لئے ہدایت'' کے معنی

اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن تو بنیادی طور پر کل انسانیت کے لئے نازل ہوا ہے مگر اس کتاب ہدایت سے حقیقی استفادہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جن میں چند صفات پائی جاتی ہیں۔ جو لوگ اپنے حیوانی وجود سے بلند ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور خواہشات نفسانی کی اندھی پیروی میں لگے ہوئے ہیں وہ اس کتاب الٰہی سے کسی بھی طرح کا فائدہ حاصل کرنے کی مطلقاً اہلیت ہی نہیں رکھتے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر قرآن صرف نیک اور صالح لوگوں کی ہی ہدایت کرتا ہے تو ان لوگوں کا کیا مقدر ہوگا جو ابھی ان صفات تک رسائی حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت تو تمام انسانیت کے لئے عام ہے جیسا کہ متعدد آیات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے (۲:۲۲ / ۲:۱۸۶ / ۳:۱۳۹ / ۴۲:۳ / ۱۷:۴۲ / ۱۸:۵۵ / ۳۰:۵۹) مگر اب یہ انسان کے اوپر ہے کہ وہ اس ہدایت سے فائدہ اٹھاتا ہے یا نہیں اور قرآن کے مطابق صرف صاحبان تقویٰ ہی اس ہدایت سے کما حقہ مستفید ہو سکتے ہیں۔

نظریۂ علم کی روشنی میں اس جملے کے معنی:

اس جملے سے ہم حصول علم سے متعلق نظریہ میں ایک اہم نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ انسان کی نیت، عمل اور اس کے علم میں ایک گہرا تعلق ہوتا ہے۔ علم کوئی مادی شئے نہیں ہے جو اپنے منکشف ہونے کا انتظار کرے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی شئے کے بارے میں ایک سرسری سا تعارف اور تصور پیدا کر لیتا ہے لیکن اس شئے کے بارے میں مکمل اور جامع علم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اس کے بارے میں کھلے دماغ کے ساتھ تحقیق کرے۔ تحقیق کرتے وقت بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا دماغ ایک صفحۂ سادہ کی طرح صاف ہو یعنی پہلے سے ہی وہ کوئی رائے اس شئے کے بارے میں قائم نہ کرے بلکہ یہ دیکھے کہ حقائق اسے کس جانب لے جا رہے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ علم ہمیشہ سعی مسلسل کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ پیہم کوششیں کرنے سے انسان اشیاء کی حقیقت اور ان کی فطرت کا ادراک حاصل کر لیتا ہے۔

یہ آیت وحی الٰہی کے سمجھنے کے طریقے پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ وحی الٰہی کا مکمل ادراک انہیں حضرات کے لئے ممکن ہے جو صحیح فکر و نظریہ رکھتے ہوں۔ اس نظریہ کے بغیر قرآن سے ہدایت حاصل کرنا تو دور کی بات ہے کبھی کبھی اس سے غلط اور گمراہ کن نتائج بھی نکالے جا سکتے ہیں۔ انسان کو قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے سچے محقق کی طرح

کھلے دماغ سے اس کی تعلیمات کی جانب رجوع کرنا چاہئے۔ اس طرح اس کا دامن کردار بھی داغدار نہیں ہونا چاہئے ورنہ دنیاوی ہوا وہوس اس کے فہم وادراک کو متاثر کردیں گی۔

آیت ۲:۳ ''جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں''

ایمان بالغیب:

درست عقیدہ اور ایمان بالغیب قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی دوسری اہم شرط ہے۔ یہ جملہ بھی اسی نتیجے کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ وحی الٰہی کو سمجھنے اور اس سے مفید ہدایت حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاس صحیح فکر اور درست نظریاتی سانچہ (Idealogical Framework) ہونا کتنا ضروری ہے ''الغیب'' یعنی نگاہوں سے اوجھل یا ماورائے حواس۔ یہ لفظ ان تمام حقیقتوں کی جانب اشارہ کرتا ہے جن کا ادراک حواس کے حدود سے بالاتر ہو یا جو کسی خاص وقت میں انسان کی نگاہوں سے غائب ہو۔ یہ ایک نسبی اصطلاح ہے، کوئی شئے جو آج ہمارے لئے غیب کا درجہ رکھتی ہے کل عالم شہود میں شمار ہوسکتی ہے۔ اسی طرح کوئی شئے جو عوام الناس کے لئے غیب ہے، اہل علم وفضل کے لئے شہود کی منزلوں میں ہوسکتی ہے۔ مگر کچھ حقائق ایسے بھی ہیں جو تمام عالم انسانیت کے فہم وحواس کی گرفت سے باہر ہیں اور انھیں حقائق کو ہم غیب مطلق کہتے ہیں۔

ایمان بالغیب سے مراد ماورائے حواس حقیقتوں کے وجود پر ایمان ہے۔ ذات الٰہی، ملائکہ اور یوم آخرت عالم غیب سے متعلق ہے۔ خالق کائنات کے وجود پر ایمان روحانی ارتقاء کی پہلی شرط ہے اور اللہ ''غیب مطلق'' ہے۔ اسی طرح آخرت کے حقائق عالم ارواح، حیات بعد الموت، جنت اور جہنم، روز قیامت وغیرہ عالم غیب کے حدود میں آتے ہیں۔ اہلبیت اطہار علیہم السلام کی چند احادیث کے مطابق اس آیت میں لفظ ''غیب'' سے مراد بارہویں امام حضرت حجۃ ابن الحسن ۔ ہیں جن کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ حضرت آج بھی زندہ ہیں مگر لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ اس نظریہ کا مندرجہ بالا باتوں سے کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ حضرت حجت کی غیبت بھی عالم غیب ہی کا ایک پہلو ہے۔

تمام مذاہب عالم اس بات پر متفق ہیں اور اسی نقطے سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں کہ اس عالم رنگ و بو سے مافوق ایک دنیائے غیب بھی موجود ہے۔ درحقیقت ایمان بالغیب ہی دین کی شناخت اور اس کی اساس ہے، جو اس پر ایمان نہ لائے وہ حقیقتاً دین ہی کا انکار کرتا ہے۔ اگر ہم ایک وسیع معنی میں دین کی تعریف کرنا چاہیں تو وہ یہی ہوگی کہ دین سے مراد غیب پر ایمان رکھنا ہے۔

یہاں یہ ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ غیب پر ایمان کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خیالی اور غیر حقیقی اشیاء پر ایمان رکھا جائے۔ روح قرآن اس سے زیادہ بعید کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ ہم یہ تصور کرلیں کہ قرآن مسلمانوں سے ایسے ایمان کا مطالبہ کرتا ہے جس کا عقل وفہم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ قرآن دراصل

ایسے ایمان کو ایمان ہی ماننے پر تیار نہیں ہے جسے عقل و خرد کی کسوٹی پر پرکھا جاسکے۔ (ملاحظہ ہو آیات ۵۳:۵۳/ ۴۶:۵/ ۳۶:۳۰/ ۱۴۹:۶/ ۷۴:۲۵) متعصب ناقدین کے اس اعتراض میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں ہے کہ قرآن غیر عقلی باتوں پر ایمان کا حکم دیتا ہے، تعصب کے پردوں کی وجہ سے یہ حضرات لفظ ایمان کے حقیقی معنیٰ سے بے خبر ہیں۔ حقیقت امر یہ ہے کہ قرآن مسلمانوں کو ایسے کسی غیب پر ایمان رکھنے کا حکم نہیں دیتا جو دائرہ عقل سے خارج ہو۔ اس کائنات میں نہ جانے کتنی ایسی چیزیں ہیں کہ حواس کی گرفت سے آزاد ہونے کے باوجود ان کے وجود سے انکار ناممکن ہے۔ ذات باری تعالیٰ اپنے کمال مطلق اور لامحدود ہونے کی وجہ سے ہمارے محدود حواس وشعور کی گرفت سے باہر ہے اسی طرح ملائکہ اور آخرت کی ابدی حیات بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف دکھائی نہ دینے کی وجہ سے ان کے وجود سے انکار کیا جاسکتا ہے؟ اگر ہمارے حواس کسی حقیقت کو محسوس نہ کرسکیں تو کیا اس حقیقت کے وجود ہی کا سرے سے انکار کردیا جائے؟ اس طرح یہ بات بالکل بے بنیاد ہے، جیسا کہ کچھ عیسائی مفسرین کا الزام ہے، کہ اسلام اپنے ماننے والوں پر مبہم اور غیر عقلی باتوں کو ایمان کے نام پر تھوپنا چاہتا ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ عیسائیت کا دامن خود اس مقام پر داغدار نظر آتا ہے، اور یہ خود اپنے ماننے والوں سے غیر عقلی عقائد (جیسے تثلیث) کو ماننے کا اصرار کرتی ہے۔

اس جملے ''جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں'' کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ مومنین اپنے تمام فرائض اور عبادات کو بغیر کسی مادی لالچ کے خلوص دل کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور ان کی راہ میں آنے والی تمام مشکلات کو کمال صبر کے ساتھ برداشت کرتے ہیں ان اعمال صالحہ کی انجام دہی میں یہ حضرات قربانیاں بھی پیش کرتے ہیں حالانکہ ان کے سامنے کوئی ظاہری انعام یا جزا کا تصور نہیں ہوتا۔

اگر انسان کے پاس درست نظریہ نہ ہو اور وہ محسوسات کی دنیا سے بلند ہونے پر تیار نہ ہو تو یقیناً وہ وحی الٰہی سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ قرآن کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔

''۔۔۔اور نماز قائم کرتے ہیں''

مذہب صرف جاننے کا نہیں بلکہ جان کر عمل پیرا ہونے کا نام ہے:

یہ قرآن فہمی کی تیسری شرط ہے اور یہی متقین کی تیسری علامت ہے۔ قرآن سے حقیقی ہدایت حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے عقاید کے عملی اظہار کے لئے حکم خدا کے سامنے سراپا اطاعت بن جائے۔ اسی راہ بندگی کے پہلے قدم کا نام ''صلوٰۃ'' ہے یعنی متقین وہ ہیں جو نمازیں ادا کرتے ہیں اور انھیں قائم کرنے میں ہر ممکن سعی کرتے ہیں۔ اسلامی طرز فکر کا یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ یہاں علم کے ساتھ عمل کا گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ اگر انسان کا عمل اس کے علم کا ساتھ نہ دے سکے تو اس کا علم ادھورا ہی سمجھا جائے گا۔ صرف دین کی معرفت حاصل کرلینے بھر سے

انسان کا شمار دینداروں میں نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ میدان عمل میں اپنے ایمان کے خلوص اور اپنی معرفت کی صداقت کا ثبوت نہ دے دے۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان کی فکر اس سانچے میں نہ ڈھلے گی اس وقت تک قرآن سے سچی ہدایت حاصل کرنا اس کے لئے دشوار ہوگا۔ اس نظریہ کے برعکس دنیا کے کچھ مذاہب صرف ایمان اور عقائد کے اقرار کر لینے ہی کو انسان کے لئے کافی قرار دیتے ہیں اور اس سے کسی عمل صالح کا مطالبہ نہیں کرتے (مثال کے طور پر عیسائیت اپنے معتقدین سے صرف یہ مطالبہ کرتی ہے کہ تم حضرت عیسیٰ مسیح کو فرزند خداوند تسلیم کرو اور ان کو اپنا نجات دہندہ سمجھو، اس کے بعد تمہیں کسی عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے اب تمہاری بخشش کے لئے حضرت مسیح ذمہ دار ہیں)

اسلام اس نظریہ کی سرے سے نفی کرتا ہے اور اپنے پیغام کی ابتداء ہی سے یہ صاف کر دینا چاہتا ہے کہ اللہ کی راہ میں عملی سرگرمی دکھائے بغیر صرف عقیدے کی بنیاد پر انسان قرآن کی ہدایت کا حقدار نہیں بن سکتا۔

نماز کے معنی اور اس کی اہمیت (یومیہ نمازیں)

نماز کے لغوی معنی دعا کے ہیں۔ نماز اس عبادت کا نام ہے جسے مسلمانوں پر دن میں پانچ وقت واجب کیا گیا ہے۔ اسلام میں نماز ایک مستقل عبادت ہے جسے ایک خاص شکل عطا کی گئی ہے اور اسے دین کا ایک اہم جزو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کی زبان میں ''صلوٰۃ'' ان تمام اعمال کا ایک علامتی نام ہے جو انسان خدا کی راہ میں انجام دیتا ہے۔ یہ دراصل اس رشتے کا نام ہے جو بندے کو اپنے معبود سے منسلک کر دیتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نماز اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام سماجی، سیاسی اور ذاتی مراحل میں اپنے خالق کا مطیع وفرماں بردار ہے۔ اسی لئے ترک نماز کو معبود کی نافرمانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ منطقی طور پر یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک طرف تو انسان اپنے خالق کی محبت اور اس کی اطاعت کا دم بھرے اور دوسری جانب اس محبت کے عملی اظہار میں پہلوتہی کرے۔ شاید یہی عبادت کا اصل مفہوم ہے کہ انسان اپنے جذبۂ عبدیت کو عمل کا لباس پہنا کر اسے منزل کمال تک پہنچا دے۔

نماز ادا کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ نبی کریمؐ اور آئمہ طاہرین نے تاکید فرمائی ہے۔ آٹھویں امام علی رضا نے محمد ابن سنان کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ نماز اس لئے بہت اہم ہے کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بزرگی کا اقرار اور ہر طرح کے شرک کا انکار ہے۔

نماز میں خداوند کریم کے حضور کھڑا ہونے کا احساس ایک بندہ مومن کے لئے گناہوں سے اجتناب کا باعث ہوتا ہے اور ہر طرح کی برائی اور بدعنوانی کے مقابلے میں انسان کے لئے ایک سپر کا کام کرتی ہے۔

بعض حضرات عبادات کی اہمیت کو یہ کہہ کر کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ سب سوائے رسم کے اور کچھ نہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ عبادت کا سیدھا تعلق انسان کی عقل وروح سے ہے لہٰذا اس میں کسی جسمانی عمل کو

انجام دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر انسان کا دماغ سرکشی کی جانب مائل ہو تو جسم کا سجدہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر انسان اپنے خالق اور اپنے دین کے لئے سنجیدہ نہیں ہے اور روح مذہب سے آشنا نہیں ہے اور اس کے بعد بھی وہ عبادتیں انجام دیتا ہے تو یہ ریاکاری ہے لیکن اس کے برعکس یہ بھی منافقت ہے کہ انسان پہلے ایک دین اور طرز زندگی کو تو تسلیم کرے مگر اپنے اعضاء جسم اور اپنے اخلاق سے اس کا اظہار نہ کرے۔ خالق کی اطاعت کی ایک علامت ہونے کے علاوہ نماز انسان کی روح کو پاک و پاکیزہ بنانے کا ایک وسیلہ بھی ہے۔ قرآن بھی یہ اعلان کرتا ہے کہ نماز کا مقصد لوگوں کے قلوب کو پاک کرنا ہے۔ (۲۹:۴۵) نماز کے ذریعے انسان کے قلب پر اللہ سے تعلق کا جو ایک دیرپا اثر قائم ہوتا ہے وہی دراصل پاکیزگی قلب و روح کا موجب ہے۔

قیام نماز ادائے نماز سے اہم ہے

صرف نماز کو ادا کردینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے قیام کے لئے مسلسل سعی کرنا بھی لازم ہے۔ نماز کا قیام خلوص دل کے ساتھ اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہونا چاہئے۔ ''یقیمون'' لفظ ''اقام'' سے مشتق ہے جس کے معنی کسی شئے کے قیام یا اس کے اہتمام و کمال انجام دینے کے ہیں۔ ''یقیمون'' یعنی وہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں، اس کے ممکنہ معنی اولاً تو یہ ہو سکتے ہیں کہ ایک مسلمان کو اپنی پوری زندگی میں نمازوں کو ادا کرنا چاہئے ثانیاً یہ کہ اسے نمازوں کو اپنے وقت معینہ پر ادا کرنا چاہئے ثالثاً یہ کہ اسے اپنی نمازوں کو خلوص دل اور روح نماز کے ساتھ ادا کرنا چاہئے۔ اسی طرح اس کا ایک مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمانوں کو نماز ہمیشہ باجماعت ادا کرنا چاہئے جیسا کہ اسی سورے کی ۴۴ویں آیت میں حکم دیا گیا ہے اور آخر میں یہ کہ انسان کو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی نماز کی جانب رغبت دلانی چاہئے۔ پورے قرآن میں ہر مقام پر لفظ صلوۃ کے ساتھ ''اقام'' (یعنی قائم کرنا) کا استعمال خود اس بات کا ثبوت ہے کہ قیام نماز، ادائے نماز سے زیادہ اہم اور وسیع معنی رکھتا ہے۔ ''یقیمون الصّلوۃ'' کے سبھی پہلوؤں کو سمجھنے کے بعد ہی ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس جملے کی تکرار اور تاکید کے پیچھے قرآن کا مقصد کیا ہے۔

''اور اس میں خرچ کرتے ہیں جو ہم نے انھیں عطا کیا ہے''

اللہ کی راہ میں مال کی قربانی:

متقین کی جماعت میں شامل ہونے کی یہ ایک اور شرط ہے۔ جب بندۂ مومن کا ایک گہرا تعلق اپنے خالق سے قائم ہو جاتا ہے تو اس کے دل کے کسی گوشے میں خدمت خلق کا جذبہ بھی انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی یہی چوتھی شرط ہے یعنی انسان راہ خدا میں اپنا

(بقیہ صفحہ۔۔۔۔۔۔۔۴۵ پر)

اس نے کہا میں تم کو تمہارے اور تم سے پہلے والوں کے خدا کی قسم دیتا ہوں یہ بتاؤ کہ کیا تم تمام لوگوں کے لئے مبعوث ہوئے ہو؟

حضرتؐ نے فرمایا: خدا شاہد ہے کہ ''ایسا ہی'' ہے۔

اس شخص نے پھر کہا: تم کو خدا کی قسم یہ بتاؤ کیا خدا نے تم کو ''نماز یومیہ'' کا حکم دیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کو شاہد قرار دیتے ہوئے مثبت جواب دیا۔

اس نے کہا خدا کی قسم میں ان تمام باتوں پر ایمان لاتا ہوں، جس پر تم ایمان لائے ہو، میں اپنے قبیلے کو چھوڑ رہا ہوں، میں ''ضمام بن ثعلبہ'' ہوں۔

یہ مبلغ اسلام کا کردار تھا جس نے اپنی کریمانہ رفتار سے لوگوں کو مسلمان کر دیا۔ لیکن آج کے مبلغین اسلام کا کردار اسلام کے تعلیمات کے برخلاف نظر آرہا ہے تبلیغ اسلام کرنے والوں کا رویہ عام افراد کو دین سے بیزار کر رہا ہے۔ ایسے اسلام کے مبلغین کا تو بس اللہ ہی حافظ ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ ہمیں شیطانی وسوسوں سے محفوظ رکھے، تبلیغ کی تمام رکاوٹوں کو برطرف کردے اور ہم سب کو اپنے وظائف کو ادا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ (الٰہی آمین)

❁❁❁

(بقیہ ــــــــــــــ تفسیر سورۃ البقرہ)

مال خرچ کرنے کو تیار ہو جائے، یہ انفاق درحقیقت انسان کے اقرار بندگی کی تصدیق ہے۔ اپنے مال کو فی سبیل اللہ قربان کر کے انسان یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ دولت کا پجاری نہیں بلکہ مرضیٔ خدا کا پابند ہے۔ اس طرح جذبۂ عبدیت کی تکمیل کے لئے یہ لازم ہے کہ انسان اپنے عقیدے اور نظریہ کے لئے مال خرچ کرنے پر راضی ہو جائے۔

آیت کے اس جملے کا اولین اور وسیع ترین مفہوم یہی ہے کہ انسان خدا کی راہ میں خیرات کرے۔ دولت، طاقت، رسوخ، جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں غرض کہ ہر وہ نعمت جو انسان اللہ کی طرف سے حاصل کرتا ہے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جانا چاہئے۔ قرآن کے مطابق تمام مادی اور روحانی نعمتوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اصطلاحی نام انفاق ہے۔

اس طرح اہل تقویٰ وہ حضرات ہیں جو نہ صرف اپنے مادی وسائل بلکہ اپنی روحانی اور ذہنی قوتیں جیسے علم، سائنس، ذہانت وغیرہ کو بھی خالق کائنات کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں انفاق کرنا نہ صرف انسانی سماج کی بہتری اور ارتقاء کی ضمانت ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنے نفس کی چند بیماریوں جیسے دنیا پرستی اور بخل و کنجوسی سے بھی چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ یقیناً یہی وہ صفت ہے جو اس دنیا کو جنگ وجدل کی دنیا نہیں بلکہ انسانیت اور تہذیب کی دنیا بنا سکتی ہے۔ یہ آیۂ کریمہ مسلمانوں کے لئے دو طرح کے فرائض کا اعلان کرتی ہے اولاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت اور ثانیاً خدمت خلق۔ ان دونوں فرائض کا بیان اس لئے کیا گیا ہے تا کہ انسان کے عقائد کا انعکاس میدان عمل میں نمایاں ہو سکے۔

❁❁❁